ایمان افروز اور سبق آموز کہانیوں کا سلسلہ

آستین کے سانپ

کہانی نمبر 1

شیطان کے پُجاری

عزام محسن

اساس انسٹیٹیوٹ

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام مجموعہ:	آستین کے سانپ
نام کہانی:	شیطان کے پجاری
مصنف:	عزام محسن
تعداد:	ایک ہزار
تاریخ:	جنوری 2024
زیر انتظام:	اساس انسٹیٹیوٹ
پبلشر:	اردو سرائے
رابطہ نمبر:	محمد عبداللہ 03349363518

دل کی بات

قدرت نے انسان کے سامنے دو راستے رکھے ہیں۔ایک حق اور دوسرا باطل...ایک سچ اور دوسرا جھوٹ...ایک صحیح اور دوسرا غلط...اس وقت دنیا میں جتنی بھی نظریاتی محنت ہو رہی ہے،اس میں ہر کوئی اپنے آپ کو حق اور سچ کا دعویدار کہتے ہوئے دوسرے کو غلط اور جھوٹ ثابت کر رہا ہے۔

خالقِ کائنات نے اپنی کتاب،قرآن مجید فرقانِ حمید میں حق اور باطل کی نشانیاں واضح کی ہیں۔حق والوں کا راستہ بھی بتایا ہے اور باطل کی ریشہ دوانیوں سے بھی پردہ چاک کیا ہے۔باطل نے حق کا راستہ روکنے کے لیے کبھی علی الاعلان اُسے للکارا ہے اور کبھی حق کا جعلی روپ دھار کر بہروپیے کی شکل اختیار کی اور حق والوں کو سیدھے راستے سے بھٹکانے کی کوشش کی ہے۔اس ساری محنت کے پیچھے نسلِ آدم کا ازلی دشمن ابلیس ہی ہے۔

ابلیس جب سے راندۂ درگاہ ہوا،تب سے ہی انسان کو گمراہ کرنے پر لگا ہوا ہے۔ایسی صورتِ حال میں انسان کے لیے درست راستے کا انتخاب ضروری اور لازم ہو جاتا ہے۔ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفی ﷺ دراصل خاتم النبین ہیں۔ان کے بعد قیامت تک کوئی نبی اپنی نبوت کے ساتھ نہیں آئے گا،مگر قدرت کے اس فیصلے سے بغاوت کرنے والے کئی شیطان کے ہرکارے میدان میں آئے،اپنا اپنا منجن بیچا،عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔انہیں میں ایک نام مرزا غلام احمد قادیانی کا ہے جس نے خود کو یسوع مسیح کہتے ہوئے نبوت جیسے عظیم مرتبے کی توہین کی۔

مرزے کی سوچ دراصل ہندوستان میں انگریز سرکار کی طے شدہ پالیسی کا تسلسل تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد مرزے کے بدبخت پیروکاروں نے اس نئے اسلامی ملک میں اپنے پنجے گاڑنے شروع کردیے۔ مگر فدایانِ ختم نبوت کی بیش بہاقربانیوں کی بدولت حکومتِ پاکستان کوانھیں غیر مسلم اور کافر قرار دیناپڑااوراب ان کا کفر آئینِ پاکستان کا حصہ ہے۔ مگراس کے باوجود قادیانی اسلام کا لبادہ اوڑھے مسلمانوں کو بہکانے میں مصروف ہیں۔اسی سلسلے میں ادارہ ''اساس'' نے بھرپور انداز میں جواب دیتے ہوئے اہلِ اسلام کوان کی چالوں سے خبردار کیاہے۔

قادیانیت کے مکروہ چہرے سے نقاب اتارتے ایسے واقعات،ایسی کہانیاں جوروز کہیں نہ کہیں وقوع پذیر ہوتی ہیں،ادارہ اساس نے انھیں جمع کرکے نئے اسلوب کے ساتھ ''آستین کے سانپ'' کا عنوان دیا ہے۔ یہ کہانیاں مختلف ذیلی عنوانات کے ساتھ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔انھیں خود بھی پڑھیے اور دوسرے مسلمانوں تک پہچانے میں ہمارے معاون بھی بنیے۔

اساس انسٹیٹیوٹ

شیطان کے پجاری

فرحان ریلوے اسٹیشن پر بے چینی سے اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہا تھا۔لاہور سے کراچی جانے والی ٹرین آنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ کر بے چین ہو رہا تھا۔وہ جس کا انتظار کر رہا تھا،اُسے نصف گھنٹا پہلے فرحان کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ ابھی تک اسٹیشن پر نہیں پہنچی تھی۔ہر آنے والا لمحہ فرحان کے لئے مشکل تر ثابت ہو رہا تھا۔

وہ کبھی ٹریک پر دور تک نگاہ دوڑا کر ٹرین کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا اور کبھی ہاتھ میں پکڑی دو ٹکٹوں کو دیکھنا شروع ہو جاتا۔ بے چینی کا یہ عالم اسے اندر ہی اندر سے کھائے جا رہا تھا۔اچانک ایک سیٹی بلند ہوئی۔ایک کوک جیسے کسی نے دور سے اس کو پکارا ہو۔ یہ ٹرین کی وسل تھی۔آواز سنتے ہی فرحان کا جسم کانپنے لگا،کیونکہ جسے اس کے ساتھ جانا تھا، وہ ابھی تک پہنچی ہی نہیں تھی۔ایک ہی لمحے میں کئی خیالات اس کے ذہن کو جھٹکے لگا رہے تھے۔

اس کا دماغ سائیں سائیں کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ: ''کیا اُسے گھر والوں نے نہیں آنے دیا؟''

''کیا اُس نے میرے ساتھ دھوکا کیا؟''

"کیا وہ کہیں راستے میں ہے یا اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے؟"

وہ بار بار اُسی کا نمبر ملا رہا تھا لیکن مسلسل بیل جانے کے باوجود آگے سے کوئی ریسپانس نہیں مل رہا تھا۔

فرحان ہاتھ میں پکڑی دونوں ٹکٹوں کو خالی نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مایوسی سے اپنے دونوں ٹکٹوں کو ریزہ ریزہ کرتا اور اپنا بیگ اُٹھا کر واپس گھر کی راہ لیتا، اچانک اس کے جسم و جان میں جیسے بجلی سی کوند گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، وہ بھاگتی دوڑتی چلی آرہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی فرحان کو جیسے زندگی مل گئی ہو۔ اس نے زور سے اُسے آواز دی اور بھاگتے ہوئے اس کی طرف لپکا۔

قریب آتے ہی جلدی سے فرحان نے اُس کے ہاتھ سے سامان پکڑ لیا۔ اِدھر ٹرین نے وسل بجا کر دھیرے دھیرے ٹریک پر سرکنا شروع کر دیا۔ بالکل فلموں جیسا منظر تھا۔ فرحان نے اپنا اور اس کا بیگ بازؤں میں اُٹھایا اور ٹرین کے مطلوبہ ڈبے کی طرف دوڑ لگا دی۔

وہ بھی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ فرحان کی تقلید میں ٹرین کے ڈبے کی جانب لپکی۔ ہارن کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ خدا خدا کر کے بھاگتے دوڑتے بہت مشکل سے دونوں ٹرین میں سوار ہونے میں کامیاب ہی ہو گئے۔ گویا دونوں اپنے گھر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

.....☆.....

ہادیہ نے کمرے میں جھانک کر دیکھا، جہاں اس کا بوڑھا باپ اور اس کے شہزادوں جیسے دونوں چھوٹے بھائی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ وہ ذرا اُن کے قریب آئی پھر دونوں کو جی بھر کر دیکھنے لگی۔ شاید آخری بار... آخری دفعہ... پھر اسی چاہت سے اُس نے اپنے باپ کے چہرے پہ آخری نگاہ ڈالی، کیونکہ وہ بہت بڑا فیصلہ کر چکی تھی۔

اس کی آنکھیں نم ناک تھیں۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے دونوں بھائیوں کی پیشانی کو چھوا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا، مگر اسے اس وقت دل کی نہیں بلکہ دماغ کی سننا تھی۔

دوسرے کمرے میں اس کی ماں سوئی پڑی تھی۔ وہ ماں جس نے باوجود غربت کے اپنی بیٹی کو کبھی بھوکا نہیں سلایا تھا۔ کبھی اسے کپڑے جوتے کی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ کوئی خرابی تھی تو صرف اتنی کہ وہ اپنی بیٹی کو نت نئے برینڈز لے کر نہ دے سکتی تھی، جو کہ نام نہاد پرسنالٹی امیج کے لیے فی زمانہ عام چلن بن چکا ہے۔

وہ اپنے پیارے اور محبت کرنے والے والدین کو سوتا چھوڑ کر اپنی تیاری میں مگن تھی۔ کسی کو اس کی حرکات و سکنات کا کچھ علم نہ تھا۔ کپڑے جوتے اور کچھ سامان اس نے اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔ اسے واپس نہیں آنا تھا۔ وہ غربت کے اندھیروں سے نکل کر دنیا کی بھول بھلیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ کسی خاص انسان نے اس کے خوابوں کی تعبیر کے وعدے کیے، تو اسے لگا کہ منزل بہت قریب ہے۔

اس فیصلے نے اس کے اندر ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ایک طرف محبت بیں گندھے رشتے اور سادگی کے سائے میں پروان چڑھنے والے سارے اپنے لوگ، اور دوسری طرف نئی زندگی، نئی دنیا اور چکاچوند روشنیوں میں اجنبی لوگ... اس نے دوسرا آپشن اپنے لیے پسند کیا تھا اور اب اس پر تیزی سے عمل جاری تھا۔

وہ اپنے خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے کہیں دور نکلنے والی تھی۔ اس کا دماغ اس کے فعل کی بھرپور مذمت کر رہا تھا۔ وہ غریب تو تھی مگر اپنے والدین کی لاڈلی بھی۔ جنھوں نے اسے بڑی مشقتوں سے پالا تھا۔ رہی بات خواہشات کی، تو کیا کبھی غریب کی خواہشات بھی پوری ہوئی ہیں؟ ہرگز نہیں۔۔۔ بلکہ خواہشات کا یہ دُکھ تو غریب لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

اس نے اپنے شفیق باپ کے جوتوں اور کپڑوں کو نہایت محبت سے دیکھا، پھر ہینگر میں ٹنگی اپنی ماں کی شال میں منہ دے کر رونے لگی۔ بالآخر اس نے اپنے محبت بھرے آشیانے کو آخری بار جی بھر کے دیکھا اور بیگ اٹھا کر گھر کے بیرونی دروازے سے باہر نکل آئی۔ گویا چڑیا کے گھونسلے سے ایک اور بچہ اپنی خواہشات کی اُڑان بھر گیا تھا۔

اُسے گھر سے نکلتے نکلتے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کے پاؤں من من بھاری ہو چکے تھے۔ وہ چیخ

چیخ کر رونا چاہتی تھی اور دنیا کو بتانا چاہتی تھی کہ میں اپنے بھائیوں اور اپنے ماں باپ سے بہت محبت کرتی ہوں، لیکن میں غربت کی چکی میں گھٹ گھٹ کر مر نہیں سکتی۔ میں نے اپنے ماں باپ کے لیے اپنے بہن بھائیوں کے لیے بہت سے خواب سجائے تھے۔ یہاں وہ خواب کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنا بیگ کندھے پر لٹکائے بڑی سی شال لیے سر جھکا کر تیز تیز چلی جا رہی تھی۔

گلی کے نکڑ پر پہنچ کر اس نے ایک بھرپور آخری نظر اپنے گھر کے ٹوٹے پھوٹے دروازے پر ڈالی اور آنکھوں میں آنسو لیے آگے روانہ ہو گئی۔ رات کی خاموشی اسے مزید خوفزدہ کر رہی تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی ایک رکشے میں بیٹھ گئی۔ اپنی منزل بتانے پر رکشے والے نے جلدی سے ریلوے اسٹیشن کی طرف رخ موڑا اور تیزی سے سفر کا آغاز کر دیا۔

اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ بار بار کسی کی کال اس کے موبائل پر آ رہی تھیں۔ مگر وہ سننے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ رکشے والے نے اسٹیشن کے سامنے بریک لگائے۔ کرایہ دیتے ہوئے ہادیہ کو محسوس ہوا کہ ٹرین تو پہلے ہی سے اسٹیشن پر موجود ہے، بلکہ وسل بجا رہی ہے۔

”اوہ.... فرحان کہاں ہو گا؟“

اسکے دماغ میں خیال آیا اور وہ بیگ اٹھا کر بھاگتی ہوئی اسٹیشن کے اندر داخل ہو گئی۔

.....☆.....

رسمی سلام دعا اور ایک دوسرے کو محبت کی نگاہ سے دیکھنے کے بعد وہ اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ دونوں کے درمیان خاموشی حائل تھی۔ شاید وہ اپنے پیاروں کو یاد کر رہے تھے۔ ماضی کے جھروکوں سے اس کے لاشعور میں ایک اجنبی آواز ابھری، تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ فرحان اپنے ماضی میں کچھ زیادہ ہی کھو چکا تھا۔ جہاں اس کی ملاقات عاصم سے ہوئی تھی۔

”بڑے خطرناک ارادے ہیں دوست!“

گزرے ہوئے وقت کی یہ آواز اسے آج بھی سنائی دے رہی تھی۔ فرحان نے ابھی پستول اپنی کنپٹی پر رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے کو جھنجوڑا اور یہ آواز لگائی تھی۔ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو ایک اجنبی شخص کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"کون ہو تم...؟" فرحان یہ سوال پوچھتے ہوئے اپنے دل کی تیز دھڑکن صاف محسوس کر رہا تھا۔

"مطلب مجھ سے پوچھ رہے ہو اور پستول اپنی کنپٹی سے لگا رکھا تھا۔ کمال کرتے ہو یار تم، اور ... یہ پستول تو مجھے دو۔"

یہ کہتے ہوئے اس اجنبی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"ہر گز نہیں... میں کیوں دوں؟ جاؤ یہاں سے...اور اپنا کام کرو۔"

فرحان نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے اس سے کہا۔

"بھئی اپنا کام ہی تو کر رہا ہوں۔ آؤ۔۔۔ اس بنچ پر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی فرحان کچھ لمحے توقف کے بعد اس کے ساتھ چل دیا۔ اجنبی نے اپنا نام عاصم بتایا تھا۔

"خودکشی کا ارادہ تھا؟" عاصم نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں...اس بات کا تجربہ کر رہا تھا کہ انگلی کا ٹریگر پر دباؤ بڑھتے ہی کیا ہوتا ہے۔"

فرحان کے لہجے کا طنز اس شخص سے چھپا نہ رہ سکا۔

"گرمی نہ کھاؤ دوست۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"فرحان..... فرحان ہے میرا نام.....!!" عاصم نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ فرحان نے ہچکچاتے ہوئے مصافحہ کر لیا۔

"گھبراؤ مت۔ مجھے معلوم ہے تم خودکشی کیوں کر رہے تھے۔" عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تت... تمہیں کیسے معلوم ہوا جب کہ میں تمہیں جانتا بھی نہیں۔"

"بھئی تم جیسے نوجوانوں کی کہانیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ تمہارا مسئلہ بیروزگار ہے....ہے نا؟ کیونکہ اس جگہ، اتنی رات گئے اپنی کنپٹی پر پستول کوئی بیروزگاری ہی رکھ سکتا ہے۔ جو اپنے معاشی حالات سے تنگ ہو۔ جو اپنی تقدیر سے روٹھا ہوا ہو.... کیوں بھئی؟ میں نے ٹھیک جانا ہے ناں

تمہارا مسئلہ ؟"

فرحان نے یہ سن کر ہولے سے سر ہلا دیا۔

"لیکن میں کروں بھی تو کیا... ؟ ہاں یہ سچ ہے کہ میں اپنی زندگی سے تنگ آگیا ہوں، اُکتا گیا ہوں اپنے حالات سے۔"

فرحان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"میں نے کتنی ہی کوشش کی نوکری کے حصول کے لیے، لیکن یہ دنیا..." اس کا لہجہ یکدم زہر آلودہ ہو گیا۔

"یہ دنیا پتا کیا مانگتی ہے ؟ رشوت... کسی بڑے آدمی کی سفارش... یہ تعلیم نہیں مانگتی، مانگتی ہے تو صرف پیسے یا پھر کسی غریب بے روزگار کا خون، لال گاڑھا خون، ہونہہ..." فرحان کا چہرہ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

"ارے.... میں بھی پہلے بالکل تم جیسا تھا۔ ایم اے کر رکھا تھا۔ بہت غریب تھا میں بھی، اوپر سے بیروزگار بھی تھا۔ ایک رات میں نے بھی اسی جگہ اپنی کنپٹی پر پستول رکھ لیا تھا لیکن..." عاصم نے بات ادھوری چھوڑی۔

"لیکن کیا؟ کیا تمہارے کندھے پر بھی کسی نے ہاتھ رکھ دیا تھا؟" فرحان درمیان میں بول اٹھا۔

"ہاں بالکل... اور آج اسی کی بدولت عیش و عشرت کی زندگی جی رہا ہوں۔ چاہو تو تم بھی یہ حاصل کر سکتے ہو۔" عاصم نے تفصیل بتائی۔

"وہ کیسے.... بتاؤ ناں مجھے جلدی سے ؟" فرحان نے یک دم چہکتے ہوئے کہا تھا۔

ٹرین اپنی پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ فرحان جو کہ سر جھکائے عاصم سے ہونے والی پہلی ملاقات یاد کر کے اپنا ماضی کرید رہا تھا، اچانک حال میں پہنچ گیا۔ وہ عاصم کے مشورے پر عمل کر کے آج واقعی "کامیاب" انسان بن چکا تھا۔

فرحان نے کچھ سوچا اور پھر ایک کامیاب مسکراہٹ اس کے چہرے پر چلی آئی۔ کیوں کہ وہ

صرف مالی طور خوشحال ہی نہیں ہوا تھا، بلکہ اب تو عاصم کے نقش قدم پر چل کر دوسروں کو بھی ''راہ حق'' کی دعوت دے رہا تھا۔اسی سلسلے میں وہ ایک غریب لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر کے نئی خوشیوں بھری زندگی دینے جارہا تھا۔جو اس کے پہلو میں بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

.....☆.....

عاصم نے فرحان کا رابطہ کامسیٹس یونیورسٹی کی رابعہ نامی لڑکی سے کروایا تھا۔رابعہ بہت ذہین اور پُراعتماد لڑکی تھی۔ صرف ایک سال کے عرصے میں فرحان مکمل طور پر رابعہ کے رنگ میں رنگا جاچکا تھا، مگر رابعہ نے رفتہ رفتہ فرحان سے فاصلہ رکھنا شروع کیا اور اُسے یاد دلایا کہ ہمارا آپس کا تعلق صرف مذہبی تربیت اور مالی تعاون کی حد تک ہے۔ تم اسی یونیورسٹی سے اپنے لیے کوئی اور ''شکار'' تلاش کر سکتے ہو۔

فرحان کو یہ بھی حکم تھا کہ وہ نئے ''شکار'' کی مکمل مذہبی تربیت کا ذمہ دار ہوگا،البتہ دونوں کی مالی معاملات کے لیے انھیں قطعاً فکر کرنے کی ضرورت نہیں،وہ نامعلوم ذرائع سے برابر پوری ہوتی رہیں گی۔

فرحان نے اسی لیے سوچ سمجھ کے ہادیہ کا انتخاب کیا تھا۔اس کے لیے اس نے رابعہ سے بھی مشاورت کرنا ضروری سمجھا تھا۔ہادیہ بہت حسین تھی،ذہین بھی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ وہ سمجھ دار اور ضرورت مند تو تھی ہی۔ اسے ہر حال میں اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے کسی بڑے ''سہارے'' کی ضرورت تھی،جو اسے فرحان کی صورت مل چکا تھا۔وہ اس وقت سفر میں اپنے مستقبل کے ہم سفر کے ساتھ ماضی اور مستقبل کے درمیان کہیں کھوئی ہوئی تھی۔گھر سے بھاگنے کے بعد اپنا پرانا نمبر وہ ہمیشہ کے لیے بند کر چکی تھی۔

کراچی پہنچ کر سب سے پہلے انھوں نے کورٹ میرج کی۔پھر ایک گھر کرائے پر لے کر اپنا چھوٹا سا آشیانہ بسا لیا۔دن یوں ہی گزرنے لگے۔ہادیہ کی خواہشات واقعی ایک ایک کر کے پوری ہونے لگی تھیں۔اب وہ برینڈ پہنتی اور برینڈ خریدتی تھی، مہنگی گاڑیوں میں سفر کرتی،شاپنگ مالز کے چکر لگاتی۔اس کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ گو کہ یہ خوشیاں والدین کے بغیر کچھ

ادھوری تھیں، لیکن پھر بھی وہ مطمئن تھی۔

ایک چیز البتہ ہادیہ کو بہت کھائے جاتی تھی۔ وہ یہ کہ اس نے فرحان کو کبھی نماز پڑھتے، یا کوئی اور عبادت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ایک دو بار جب اس نے فرحان سے اس موضوع پر بات کرنا چاہی تو جواباً مذہب پر اُسے الٹی سیدھی باتیں سننے کو ملی تھیں۔ مولویوں کے لیے اس کے منہ سے گالم گلوچ الگ سے تھی۔

ہادیہ کو یہ سب عجیب سا لگا۔ پھر اس نے فرحان کا بغور مشاہدہ کرنا شروع کیا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کیوں کہ فرحان کی بہت سی حرکات اس کے لیے مشکوک سی تھیں۔ ہفتے کے دن ہادیہ اور فرحان نے شاپنگ کے لیے نکلنا تھا۔ وہ دونوں تیار ہوئے مگر پھر فرحان نے طبیعت ناسازی کا بہانہ کر کے اسے اکیلے جانے کا مشورہ دیدیا۔ چارو ناچار ہادیہ دو تین گھنٹے کا کہہ کر ٹیکسی لیے تنہا شاپنگ مال کی طرف نکل گئی۔

ابھی مارکیٹ میں آئے اسے آدھا گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کو چکر آنا شروع ہو گئے۔ زیادہ طبیعت خراب ہونے پر اسے قے آنے لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید اللہ نے اسے خوش خبری دکھائی ہو، مگر یہ حتمی بات نہ تھی۔ اس نے جلدی سے ٹیکسی کروا کر گھر واپسی کر لی۔ مگر یہ کیا؟ اپنے گھر کے باہر دو گاڑیاں کھڑی دیکھ کر وہ حیرران رہ گئی تھی۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی، ڈرائنگ روم سے آنے والی آوازوں نے اس کے قدم روک لیے۔

"فرحان یار...!! وہ تھرڈ ائیر کی رابعہ نے اس مشن کے لیے جو بہادری دکھائی ہے، وہ قابل تعریف ہے۔ مگر تم ابھی تک ہادیہ کو راہ راست پر نہیں لا سکے۔ اس کی کیا وجہ ہے فرحان؟" یہ ایک بھاری بھر کم آواز تھی۔ کسی اجنبی کے منہ سے اپنا نام سن کر ہادیہ کو ایک جھٹکا لگا۔ اس نے کان دیوار کے ساتھ لگا دیے۔ اندر ایک اور آواز فرحان سے مخاطب تھی۔

"ہاں فرحان! رابعہ کو تو یونیورسٹی سے نکال دیا گیا ہے۔ تحقیقاتی کمیٹی نے اس الزام کو درست پایا ہے کہ رابعہ نا صرف اسٹیکر پھاڑنے میں ملوث تھی، بلکہ وہ ہمای مذہبی تعلیمات سے بھی دیگر طلبا و طالبات کو اپنا گرویدہ بنا رہی تھی۔ بڑی امید تھی کہ عاصم اور اپنے دیگر لوگ اس مسئلے پر قابو

پالیں گے، مگر براہویونیورسٹی کے چند مولوی طلباکا، جنھوں نے ڈائریکٹر کے آفس کے باہر نوجوانوں کی بھیڑ اکٹھی کر کے اپنا مطالبہ منوالیا۔"

یہ کسی اور آدمی کی آواز تھی۔ پھر ایک تیسری آواز ابھری:

"رابعہ ہمارے لیے ہماری جماعتِ احمدیہ کا نادر اثاثہ ہیفرحان۔ اس کے لیے اب ہم نے کوئی دوسرا مشن سوچ لیا ہے۔ مگر تمھیں اب اپنی پراگریس سے جلد ہمیں خوشخبری سنانا ہوگی۔"

یہ سنتے ہی ہادیہ کو لگا کہ جیسے اس پر کوئی پہاڑ گر پڑا ہو۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کیوں کہ وہ ختم نبوت کے بنیادی عقائد اور قادیانیت کے مکروفریب سے کسی حد تک آگاہ تھی۔ اسے اپنے قدم من من بھر کے لگ رہے تھے۔ وہ روتی ہوئی اپنے بیڈروم کی طرف بھاگی۔

"یااللہ.... میں کہاں پھنس گئی۔ میری تو دنیا اور آخرت ہی اُجڑ گئی۔ تجھے تیری کبریائی کا واسطہ ہے یارب...!! مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ تیرے حبیب کے دشمنوں کا گروہ ہے۔ ہائے میرے امی ابو اور میرا گھر بار... کک... کیا مجھے اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے؟"

ہادیہ پاگلوں کی طرح اپنے سر کے بال نوچ رہی تھی۔ ایک لمحے میں فرحان اس کے لیے خوابوں کے شہزادے سے بھیڑیا نما انسان بن چکا تھا۔ اس نے دنیاوی آسائشوں کے لیے اپنے والدین، اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑا تھا۔ مگر حقیقت میں اس نے دنیا و آخرت کے لیے گھاٹے کا سودا کیا تھا۔ اسے اپنی اس حرکت پر اب گھن آرہی تھی۔

.....☆.....

رات بھر رونے اور اگلے دن اُداس رہنے کے بعد اب وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ اسے جینا تھا تو اپنے دین اور نظریے کی حفاظت کے لیے، ورنہ اس سے بہتر اسے موت پیاری تھی۔ اسے اپنی کلاس فیلو رابعہ کی حرکتیں اور مذہب کا مذاق اُڑانے والی اس کی تمام باتیں ایک ایک کر کے یاد آرہی تھیں۔ فرحان اب اس کے نزدیک ایک دھوکے باز اور مرتد انسان تھا۔ چناں چہ رات کی تاریکی میں اس نے چھپ کر اللہ سے مانگا تھا۔

"یااللہ میرے سارے گناہ معاف فرمادے۔"

"اے میرے رب! مجھے اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے۔ میں نے اپنے والدین اور گھر سے بے وفائی کی۔ تُونے مجھے ایمان کے ڈاکوؤں کا سامنا کروادیا۔ اے میرے خدا۔۔! مجھے معاف کرنا اور اپنے دربار میں سرخرو کردینا۔"

دعا مانگنے کے بعد اس نے کچن سے بڑی چھری اُٹھائی اور اپنے بیڈروم کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ جہاں فرحان بے سدھ خراٹے لے رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آکر غصے سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے تن من میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی انتہائی قدم اٹھاتی، اچانک فرحان کی آنکھ کھل گئی۔ سامنے کا منظر نامہ دیکھ کر وہ سب سمجھ چکا تھا۔ مارے غصے سے وہ پھنکار رہا تھا۔

اس کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا۔ حیرت سے وہ ہادیہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں؟" وہ چِلایا اور ایک دم سے ہادیہ پر حملہ آور ہو گیا۔

ایک جھٹکے میں اس نے ہادیہ کو قابو کیا اور اسے رسی کی مدد سے باندھ دیا، پھر اس واقعہ کی تفصیل وہ جلدی سے اپنے قریبی ساتھیوں کو دینے لگا۔ کچھ ہی دیر میں ہادیہ پولیس اسٹیشن پہنچادی گئی۔ جہاں مکمل ثبوتوں کے ساتھ بااثر ہاتھوں نے اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلنے کا انتظام کرلیا تھا۔ مگر شاید یہ ہادیہ کی دعاؤں کا اثر تھا کہ اس کی درخواست پر پولیس والوں نے اس کا رابطہ اس کے گھر والوں سے کروایا دیا تھا۔

ساری بات معلوم ہونے کے بعد اس کے والدین اپنی بیٹی کے پیچھے کراچی پہنچنے کی تیاری کرنے لگے تھے۔ مگر دوسری طرف اسلام کے نام پر بننے والے اس وطن میں مسلمانوں کا لبادہ اوڑھے غدارانِ ملک وملت بے خوف وخطر اپنے اگلے شکار کے لیے نکل چکے تھے۔ شیطان کے یہ پجاری اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک میں کامیابی سے اپنا دھندہ جاری رکھے ہوئے تھے۔

☆....☆....☆